اقبال اجداد کے دیس میں

ڈاکٹر ظفر حسین ظفر

۱

اسلامی تہذیب وتمدن کے قدیم مراکز کو اقبال اپنا ورثہ تصور کرتے تھے۔ بغداد، ہسپانیہ، قرطبہ، فلسطین، دلی اور حجاز مقدس کے تذکرے کلام اقبال میں موجود ہیں۔ عالم اسلام کے دیگر تہذیبی مراکز اقبال کے نطق وکلام کا جزو ہیں تو کشمیر کی حیثیت دوگونہ ہے کہ آپ نسلاً کشمیری تھے۔ کشمیر ہزاروں سال سے اسلامی تہذیب وتمدن کا مرکز رہا ہے۔ اسے اہل نظر نے ''ایران صغیر'' سے تعبیر کیا۔ غنی کشمیری، شاہ ہمدان، انور شاہ کاشمیری اور اپنے جداعلیٰ بابا لول حج (جو سلسلہ ریشیاں سے وابستہ تھے) سے اقبال کی روحانی وابستگی تھی۔ آپ کے اجداد نے چودھویں یا پندرھویں صدی میں کشمیر سے ہجرت کی اور سیالکوٹ آ کر آباد ہو گئے۔ صدیاں گزرنے کے بعد بھی کشمیر سے ان کی والہانہ محبت ان سے نہایت جذباتی اشعار کی تخلیق کا باعث بنتی نظر آتی ہے گویا وہ ابھی تک اپنے کالبدِ خاکی کو کشمیر ہی کی گلزار آفریں خاک کا پتلا سمجھتے تھے۔[1]

تنم گلے ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است[2]

میرا جسم تو کشمیر جنتِ نظیر کی کیاری/ کے باغ کا ایک پھول ہے جب کہ میرا دل حجاز کا گھر اور میری نوا شیراز سے ہے۔[3]

اقبال وطنیت کے مغربی تصور کے سخت خلاف تھے۔ اس کے پیرہن کو مذہب کا کفن سمجھتے تھے۔ ''لیکن وہ اپنے قلب کی گہرائیوں میں اپنے آپ کو کشمیر ہی کے کنعان کا گم گشتہ یوسف سمجھا تھا''[4] کشمیریوں کی داستانِ الم بھی بہت قدیم ہے۔ فطری حسن سے مالا مال یہ سرزمین ہمیشہ بیرونی جارحوں، غاصبوں اور لٹیروں کی زد میں رہی ہے۔ اس قوم کا حال و مستقبل ہمیشہ غیر یقینی کیفیات سے دوچار رہا ہے۔ اس کو تقدیر کا لکھا سمجھیں یا خود فراموشی ......؟ کشمیر کی پوری تاریخ کشمکش اور جدوجہد سے عبارت ہے۔ بیرونی حملہ آوروں نے آتش و آہن کے ذریعے یہاں کے مکینوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ اہل کشمیر نے دل سے کبھی بیرونی جارحیت اور غلامی کو قبول نہ کیا۔ تاریخ کشمیر کے ہر دور میں حریت فکر کا چراغ روشن رہا اگرچہ اس کی روشنی مدہم رہی اور اندھیر نگری کا دور طویل ہوتا رہا۔ اقبال اگر نسلاً کشمیری نہ بھی ہوتے، پھر بھی حرّیتِ فکر اور خودی

کے ترجمان کی حیثیت میں وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے دکھ اور درد کو ضرور محسوس کرتے۔

یہ تو کشمیریوں کا بخت ہے کہ اس خاک سے اقبال کا خمیر اٹھا، جو عہد حاضر میں ''جہانِ شعروادب کا پیغمبر'' ٹھہرا۔[۵] اقبال اور کشمیر ایک جذباتی اور روحانی موضوع ہے۔ اقبال کو کشمیر سے اور کشمیر کو اقبال سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اس لیے کہ اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں مولوی میر حسن کا فیضانِ نظر، گورنمنٹ کالج لاہور میں آرنلڈ کی صحبت، کیمبرج اور ہائیڈل برگ کی رومان پرور فضاؤں کا عمل دخل ضرور ہے ''لیکن ان کی شخصیت کی مجموعی تشکیل وتعمیر میں ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ ان کے آباء واجداد کے گونا گوں اثرات کا بھی دخل ہے، جن کا خون اقبال کی رگوں میں گردش کر رہا تھا''۔[۶]

میں اصل کا خاص سومناتی
آبا مرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد
میری کفِ خاک برہمن زاد[۷]

اقبال کے جداعلیٰ بابا لول حج برہمنوں کی ایک گوت ''سپرو'' سے تعلق رکھتے تھے۔ سپرو کی تفصیل اقبال نے محمد دین فوق کو ۱۶؍جنوری ۱۹۳۴ء کے ایک خط میں لکھی:

جب مسلمانوں کا کشمیر میں دور دورہ ہوا تو براہمہ کشمیر مسلمانوں کے علوم وزبان کی طرف بوجہ قدامت پرستی یا کسی اور وجوہ کے توجہ نہ کرتے تھے۔ اس قوم میں سے پہلے جس گروہ نے فارسی زبان وغیرہ کی طرف توجہ کی اور اس میں امتیاز حاصل کر کے حکومتِ اسلامیہ کا اعتماد حاصل کیا وہ ''سپرو'' کہلایا۔ اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو سب سے پہلے پڑھنا شروع کرے۔[۸]

''سپرو'' ایک صفاتی نام ہے جس کی خاندانِ اقبال کے ساتھ خاص نسبت قائم ہوگئی۔ پروفیسر چمن لعل سپرو، ''سپرو'' کو ایک خاندانی Nickname تسلیم کرتے ہیں:

سپرو، سہ+ پرو سے بنا ہے۔ اس کا مطلب ہے تین زبانوں کا جان کار۔ مسلم دورِ حکومت میں ہمارے خاندان کو اس بات کا شرف حاصل رہا ہے کہ ہم سنسکرت کے ساتھ عربی اور فارسی کے بھی عالم تھے اور یہ سلسلہ میرے دادا نارائن جُو سپرو تک قائم رہا۔ جس طرح دو، تین اور چار ویدوں کے عالم کو دوویدی، ترویدی اور چترویدی کہتے ہیں اسی طرح تین زبانوں کے عالم کو سہ پرو کہا گیا، جو بعد میں سپرو مشہور ہوگیا۔[۹]

محققین نے ''بابا لول حج کو سپرو خاندان کا پہلا نومسلم قرار دیا ہے۔''[۱۰] لول، لالہ یا لال کشمیری میں پیار ومحبت کی علامات ہیں۔ آج بھی یہ لفظ انھی معنوں میں مستعمل ہے۔ محمد دین فوق، اقبال کے قریبی احباب میں سے تھے۔ فوق کے نام اقبال کے ۲۵ خطوط ہیں۔ فوق لکھتے ہیں:

سلطان زین العابدین بڈ شاہ کے زمانے (تخت نشینی ۸۲۶ھ وفات ۸۷۴ھ) میں حضرت شیخ العالم شیخ نور

الدین ولی کے ارادت مندوں میں حضرت بابا نصرالدین ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں...... بابا نصرالدین کے مریدوں میں بابا لولی حاجی ایک بزرگ تھے جنھوں نے کئی حج کیے تھے اور بارہ سال تک کشمیر سے باہر سیر وسیاحت ہی میں رہے تھے۔[۱۱]

اقبال کے جدّ اعلیٰ کب مسلمان ہوئے؟ اس پر مختلف آراء ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کی تحقیق کے مطابق: ''اقبال کے جدّ اعلیٰ پندرھویں صدی عیسوی میں مسلمان ہوئے۔''[۱۲] اقبال کے اجداد کی کشمیر سے پنجاب میں ہجرت کی کوئی متعین سامنے تاریخ نہیں آئی۔ ''قرائن یہ ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں یہ ہجرت ہوئی ہوگی۔''[۱۳]

بہرحال اٹھارھویں صدی ختم ہورہی تھی یا انیسویں شروع۔ شیخ محمد اکبر کے پوتے یا پڑپوتے شیخ جلال الدین تھے ان کے چاروں بیٹے انھیں لے کر پہاڑوں سے نیچے اتر آئے۔ عبدالرحمٰن، محمد رمضان اور محمد رفیق سیالکوٹ میں آباد ہوئے۔ جب کہ سب سے چھوٹے عبداللہ نے موضع سیالکوٹ کے ضلع جھٹیکے میں سکونت اختیار کی۔[۱۴]

کشمیر پر رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۹ء میں قبضہ کیا جو ۱۸۴۶ء تک جاری رہا۔ یہ افراتفری، انارکی، جور و جبر اور ظلم کا عہد تھا۔ امکان ہے کہ مہاجرت اختیار کرنے والے سپرو خاندان کے یہ افراد سکھا شاہی کے ظلم سے تنگ آئے ہوں گے۔ اس بات پر اتفاق ہے کہ وادی گل رنگ سے مہاجر ہونے والا یہ قافلہ پہلے پہل براستہ جموں سیالکوٹ میں داخل ہوا اور یہیں سکونت پذیر ہوگیا: ''اسی شہر کی خوابیدہ اور خاموش گلیوں میں اقبال کا بچپن گزرا۔''[۱۵]

۲

اقبال نے کشمیر کے مرغزاروں اور پہاڑوں کے بجائے پنجاب کے میدانوں میں آنکھ کھولی۔ پنجاب کے آب وگل سے اقبال کو ایک نئے سانچے میں ڈھل جانا چاہیے تھا لیکن ایسا نہ ہوا...... کشتِ کشمیر کی خاک اقبال کی رگوں میں خون بن کر گردش کرنے لگی۔ ان کا جسم پنجاب کے میدانوں میں سرگرم عمل رہا جب کہ روح ان پہاڑوں میں محوِ ترنم رہی، جہاں سے ان کے اجداد اترے تھے۔ یہ مٹی کی محبت تھی یا بابا لول حج کی روحانی کشش...... اقبال کشمیر اور اہل کشمیر کی یاد سے کبھی غافل نہ رہے۔

کشمیر جنت نظیر سے اقبال کے وجودِ معنوی کو کچھ ایسا گہرا ربط ہے کہ اگر ہم اقبال کی شخصیت اور شاعری کو علامتی صورت میں دیکھنا چاہیں تو تخیل میں وادی کشمیر کے جلیل وجمیل نقوش ابھر آتے ہیں۔ اس کے برف پوش، پُر جلال کہسار، اقبال کے فکر روشن کی تاب ناک رفعتوں کے عکاس ہیں اور اس کی گل بہ داماں وپُر بہار وادیاں، کلام اقبال کی شعری اور فنی رنگینیوں کی آئینہ دار۔ اقبال کی مفکرانہ شخصیت ہمیں ان مہاتماؤں کی یاد دلاتی ہے، جو ہمالیہ کے دامن میں دھونی رمائے، آسن جمائے، چپ چاپ گیان دھیان میں محو رہتے تھے اور

اس کی شاعرانہ فطرت کو وادی کے باسیوں کے ذوق جمال، حسن آفرینی و ہنرمندی سے ایک نسبت خاص ہے......اور کیوں نہ ہو کہ اقبال خود بھی اسی گلشن کا گل سرسبد ہے۔[۱۶]

اقبال ستمبر ۱۸۹۵ء میں سیالکوٹ سے لاہور منتقل ہوئے۔ لاہور میں قیام کے دوران باقی مشاغل کے ساتھ اقبال ''مجلس کشمیری مسلمانانِ لاہور'' (قیام ۱۸۹۶ء) کے اجلاسوں میں اپنے دوست محمد دین فوق کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اس مجلس کے قیام کے موقع پر اقبال نے اپنی طویل نظم ''فلاحِ قوم'' پڑھی، جو بعد میں رسالہ مجلس کشمیری مسلمانانِ لاہور میں شائع ہوئی۔ اقبال اس انجمن کے سیکریٹری بھی بنے اور کشمیری مسلمانوں کے فلاح و بہبود کے کاموں میں گہری دل چسپی لیتے رہے۔ اقبال قیام لاہور کے دوران ہی سیاحت کشمیر کی خواہش رکھتے تھے۔ فکر معاش، ازدواجی الجھنیں اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانگی (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) جیسے کئی مسائل آڑے آتے رہے۔ چنانچہ یہ خواہش، خواہش ہی رہی۔ اپنی اس دیرینہ آرزو کا تذکرہ متونِ اقبال میں کئی مقامات پر ملتا ہے۔ ۲۱ مئی ۱۹۱۵ء کو مہاراجہ کشن پرشاد کو لکھتے ہیں:

> لاہور کی گرمی سے سخت گھبرا رہا ہوں۔ جون کے مہینے میں اگر فرصت کے دو ہفتے مل گئے تو کشمیر چلا جاؤں گا۔ آج کل وہاں کا موسم نہایت دل فریب ہے......معلوم نہیں آپ نے کبھی کشمیر کی سیر کی یا نہیں۔[۱۷]

جون ۱۹۱۵ء، جولائی ۱۹۱۵ء کے خطوط بھی مہاراجہ کے نام ہیں اوران میں یہی آرزو مچلتی ہے: ''گرمی کے موسم میں کشمیر کی سیر ہو اور آپ کے ہم رکاب تو اس سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہو سکتی ہے؟ خدا نے چاہا تو یہ موقع بھی آجائے گا۔''[۱۸]

۱۱ر ستمبر ۱۹۱۶ء محمد نیاز الدین خان اور ۲۸ر جون ۱۹۱۷ء مولانا گرامی کے نام لکھے گئے خطوط میں بھی ارادے بنتے اور پھر ٹوٹ جاتے ہیں لیکن عزم کی چنگاری ہے کہ سرد نہیں ہوتی۔

ع　کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو[۱۹]

مولانا گرامی کو لکھتے ہیں: ''کشمیر کی سیر کا آپ کی معیت میں لطف ہے۔ غنی کشمیری کی روح خوش ہوگی کہ گرامی جالندھری اس کے مزار پر آئے ہیں۔''[۲۰] محمد الدین فوق کا رسالہ رہنمائے کشمیر نظر سے گزرا تو ۸ر جون ۱۹۱۷ء کو فوق کے نام لکھتے ہیں: ''افسوس کہ میں نے آج تک کشمیر کی سیر نہیں کی لیکن امسال ممکن ہے کہ آپ کا رسالہ مجھے بھی ادھر کھینچے۔''[۲۱] اقبال سیاحت کشمیر کا جب بھی ارادہ باندھتے وہ تشنۂ تکمیل رہتا۔ ہر بار کیفیت یہ ہوتی ہوگی:

ع　جو مشکل اب ہے یا رب پھر وہی مشکل نہ بن جائے[۲۲]

شاید اقبال اپنے دل کو ڈھارس دیتے ہوں گے:

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی[۲۳]

بالآخر اس نالۂ خام کو کاتب تقدیر نے شرف باریابی بخشا اور جون ۱۹۲۱ء میں اقبال لاہور سے راولپنڈی روانہ ہوئے۔ براستہ مری، کوہالہ مظفر آباد سے ہوتے ہوئے سری نگر پہنچے۔ راولپنڈی اور سری نگر کے درمیان ۲۰۰ میل لمبی سڑک پرتاب سنگھ (۱۹۲۵ء-۱۸۸۵ء) کے دور میں شروع ہوئی۔ کوہالہ سے راولپنڈی تک ۶۴ میل کا علاقہ پاکستان کی حدود میں ہے۔ جب کہ کوہالہ سے سری نگر ۱۳۳ میل کے لگ بھگ ہے۔ آج یہ پوری سڑک (راولپنڈی تا سری نگر) دورویہ ہے۔ گاڑیاں برق رفتار ہیں۔ جب کہ جون ۱۹۲۱ء میں کیفیت اس کے برعکس تھی۔ ''اس زمانے میں ٹھوس ٹائروں والی گاڑی چلتی تھی جو آرام دہ نہیں تھی''۔[۲۴]

تب راولپنڈی اور کشمیر کے درمیان ''تانگہ کمپنی'' بھی چلتی تھی۔ اس کے علاوہ ''ایمپیریل کیرنگ کمپنی'' اور این دی ہری رام اینڈ برادرز جیسی کمپنیوں کے پاس لاری اڈوں کے ٹھیکے تھے۔ ۱۹۴۷ء کے زمانے میں راولپنڈی سے سری نگر نندہ بس اور الائیڈ چراغ دین اور آر ایس ٹی چلتی تھی۔[۲۵]

اقبال نے یہ طویل اور تھکا دینے والا سفر کتنے دنوں میں مکمل کیا۔ راستے میں کہاں کہاں پڑاؤ ڈالا؟ اس حوالے سے کوئی شواہد موجود نہیں ہیں۔ البتہ قیاس ہے کہ اقبال سری نگر اور کوہالہ کے درمیان کسی مقام پر ضرور رکے ہوں گے۔ اس شاعر فطرت شناس کی نگاہیں قدرتی حسن سے مالا مال اس گزرگاہ پر کئی بار اٹکی ہوں گی:

فضا نیلی نیلی ہوا میں سرور
ٹھہرتے نہیں آشیاں میں طیور[۲۶]

ملکۂ کوہسار مری کے دلفریب مناظر، کوہالہ سے مظفر آباد تک کنارِ جہلم سفر اور اس جوئے آب کا اچھلنا، سنبھلنا، سرکنا، لچکنا، بل کھانا یقیناً اقبال کے لیے خوشی اور فرحت کا باعث ہوا ہوگا۔ جون کے مہینے میں یہ آب جو اپنے جوبن پر ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے دل چیرتی ہے۔ کناروں سے سر مارتی ہے اور اپنی منزل کی جانب سبک رفتاری سے رواں دواں ہوتی ہے۔ شاید اقبال کو اس سفر میں ہائیڈل برگ اور دریائے نیکر کی رومان پرور یادیں بھی عود کر آئی ہوں۔ یہ سب قیاسات ہیں لیکن اس سڑک پر جس نے بھی سفر کیا اس کی طبیعت فطرت سے ہم آغوش ضرور ہوئی۔ اقبال اپنے فرزند جاوید اقبال سے کہتے ہیں کہ

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر[۲۷]

اس کی روشنی میں کیا یہ قیاس حقیقت کے قریب نہیں ہے کہ اس دل فریب سفر کے دوران لالہ وگل کا سکوت ٹوٹا ہوگا اور اقبال ان سے ہم کلام ہوئے ہوں گے۔ پھر بارہ مولہ سے سری نگر تک ۳۴ میل کا بالکل ہموار کشادہ اور دورویہ سایہ دار دیوہیکل چناروں سے ڈھکا ہوا سفر کس قدر رومان انگیز ہوا ہوگا؟ مسٹر نائٹ برطانوی فوجی افسر تھا اُس نے ۱۸۸۱ء میں کشمیر کا دورہ کیا وہ ڈیڑھ مہینا کشمیر میں مقیم رہا۔ بھمبر کے راستے داخل ہوا اور مظفر آباد کے راستے واپس آیا۔ اُس نے اس (بارہ مولہ تا سری نگر) ۳۴ کلومیٹر سڑک کے ٹکڑے

کے بارے میں کہا ہے کہ ''یہ دنیا کی خوبصورت ترین سڑکوں میں سے ایک ہے۔''[۲۸]

اقبال نے یہ سفر شوق نندہ بس سروس یا کسی دوسری ٹرانسپورٹ سروس کے ذریعے کیا ہوگا۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ سیٹھ محمد بخش نے اقبال کے لیے الگ سواری کا انتظام کیا ہو۔ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی اقبال کے سفر کے حوالے سے یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کے سفر کے لیے سیٹھ صاحبان نے پرائیویٹ سواری کا انتظام کیا ہو؟ راستے میں مسافروں کے قیام و طعام کا انتظام اس شاہراہ پر اس دور میں موجود ہوتا تھا۔ اقبال اس طویل سفر کے دوران لازماً ضرورت کے مطابق رکے ہوں گے لیکن تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ کشمیر سے خاص نسبت کے باعث اقبال کے اس سفر میں جوش و ولولہ، حسرتِ دید اور والہانہ پن فطری تھا۔ یقیناً وہ منزل پر پہنچنے کے لیے بے تاب ہوئے ہوں گے۔ ''ساقی نامہ'' بالِ جبریل کے یہ اشعار آپ کے قلب و روح کی کیفیت کے عکاس ہیں:

مجھے عشق کے پر لگا کر اڑا
مری خاک جگنو بنا کر اڑا

جگر سے وہی تیر پھر پار کر
تمنا کو سینوں میں بیدار کر[۲۹]

اقبال نے یہ سفر ۴۴ سال کی عمر میں کیا۔ سفر کا سبب ایک مقدمہ بنا۔ مولوی احمد دین وکیل اور منشی شیخ طاہر دین آپ کے ہم رکاب تھے۔ آپ نے دو ہفتے کشمیر میں قیام کیا۔ اس حوالے سے بھی متضاد بیانات ہیں۔ صحیح تاریخ کا تعین بھی نہیں ہے۔ ۱۹۲۱ء ریاست شخصی حکومت کی مطلق العنانیت کا شکار تھی۔ ۱۸۴۶ء کے بیع نامۂ امرتسر کے بعد کشمیر اپنے مکینوں سمیت ایک شخص کی ذاتی جاگیر تھی۔ بے پناہ قدرتی حسن اور وسائل سے مالا مال اس خطہ جنت نظیر کو گلاب سنگھ کی ذرّیت اپنی ذاتی ملکیت اور اس کے ذہین و فطین فرزندوں کو اپنا مزارع اور زرخرید غلام تصور کرتی تھی۔ اقبال تاریخ کشمیر کے نشیب و فراز سے واقف تھے۔ کشمیریوں کے حال و مستقبل کے بارے میں اقبال کی پریشانی تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ پل پل کی خبر نہ سہی (یہ ان کے لیے ممکن بھی نہ تھا) لیکن عمومی معاملات اور مسائل اقبال کی نگاہ میں تھے۔ سیاحت کشمیر سے اس شاعر فطرت نے ضرور حظ اٹھایا ہوگا لیکن سینہ چاکانِ چمن کی حالت زار سے وہ بہت بیزار اور مضطرب ہوئے۔ آپ کے قلب و ذہن پر اہل کشمیر کی مجبوری اور مقہوری اور ان کے طرز عمل نے بہت اثرات ڈالے۔ گلِ لالہ کی سرخی سے اقبال نے اپنے دل کو تشبیہ دیتے ہوئے فرمایا:

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی
تصویر ہمارے دلِ پُرخوں کی ہے لالہ[۳۰]

حضرت اقبال کشمیر پہنچے تو ان کی مصروفیت کے کئی دائرے اور ابعاد تھے۔ پیشہ ورانہ طور پر انھیں سیٹھ شیخ محمد بخش اور سیٹھ کریم بخش کے مقدمے کی پیروی کرنا تھی۔ مقدمہ اے ڈی حکیم سیشن جج کی عدالت میں تھا۔ مقدمے کا فیصلہ اقبال کی واپسی لاہور کے بعد ہوا۔ فیصلہ حسبِ منشا نہ ہوا جس کا اقبال کو قلق رہا۔ اس دوران اقبال کو قتل کا ایک اور مقدمہ ملا۔ رحمٰن راہ ایک کشمیری مقدمۂ قتل میں گرفتار تھا۔ آپ نے پیروی کی تو مقدمے کی سزا عمر قید میں بدل گئی۔ ۲۰/اپریل ۱۹۲۲ء کو منشی سراج الدین کے نام لکھا:

افسوس کہ رحمان راہ کامل طور پر نہ بچا گو پھانسی سے بچ گیا۔ اگر رحمان راہ کے وارثوں کا ارادہ اپیل کرنے کا مصمم ہو تو میں بغیر کسی مزید فیس کے ان کی اپیل لکھ دوں گا۔ آپ یہ امر ان کے گوش گزار کر دیں۔[۳۱]

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال نے ہر دو مقدمات کے لیے مناسب فیس وصول کی تھی۔ اقبال محض قانونی موشگافیوں میں الجھے ہوئے وکیل نہ تھے بلکہ ایک ''پُر سوز نغمہ خواں'' شاعر فطرت تھے۔ قانونی امور سے فراغت کے بعد اقبال سر بہ فلک برف پوش چوٹیوں، بکھری بکھری شاداب جھاڑیوں، ڈل کے حسین اور شوخ جھرنوں، ڈل کے پانی پر تیرتے ہوئے ان گنت شکاروں کی دوڑ دھوپ اور نشاط باغ کے سایہ دار چناروں کی رعنائیوں سے لطف اٹھاتے رہے۔

۳

اقبال کے دل فطرت شناس نے نشاط باغ[۳۲] اور شالا مار باغ[۳۳] کے خاموش سبزہ زاروں کو ساقی نامہ پیام مشرق اور ارمغانِ حجاز کی نظموں میں نطق وکلام عطا کیا ہے۔ دنیائے رنگ و بو کی یہ بے مثال وادیِ کشمیر اقبال کے اجداد کی سرزمین تھی۔ قدرت نے اقبال کو صرف ایک ہی بار اس کے نظر کش نظاروں کو اپنے قلب و روح میں اتارنے کا موقع فراہم کیا وگرنہ اپنی عمر کے آخری حصے تک اقبال نیرنگیِ فطرت کی اس تفسیر کو دیکھنے کی خواہش رکھے ہوئے تھے۔ صاحبزادہ محمد عمر کشمیری[۳۴] کے مطابق:

ان ناقابل فراموش ایام (اقبال کے قیام سری نگر) میں ایک دن جناب مولوی احمد الدین مرحوم وکیل لاہور، منشی نور الٰہی مرحوم (میرے ازلی شریک کار) اور اس خاکسار نے بڑی جدوجہد کے بعد حضرت والا کو جھیل ڈل کی سیر پر مجبور کیا۔ جنھیں آنحضرت کا شرف قرب حاصل ہے ان پر مخفی نہیں کہ آپ کو کسی جگہ تشریف ارزانی فرمانے پر آمادہ کرنا کس قدر مشکل مہم تھی۔ موٹر کے ذریعے نشاط باغ جا کر ڈل کی بہار دیکھنا آپ نے مصنوعی (خلاف فطرت) قرار دیا اور ہم تینوں آنحضرت کے ساتھ شکارے (ایک ہلکی سی کشتی) میں بیٹھ کر ڈل کی طرف روانہ ہوئے۔ شالامار، نسیم اور نشاط باغ کو پسند کیا اور ''زہد شکن'' کا خطاب عطا کیا۔ کیا جامع تعریف ہے۔ واپس ہوئے تو دونوں وقت مل رہے تھے۔ آفتاب آخر منزل پر پہنچ رہا تھا، شفق پھول رہی تھی اور یہ منظر سالم کا سالم ڈل کے شفاف پانی میں تیر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک صحیفۂ قدرت کے اس سنہری ورق کا خاموشی سے مطالعہ کرنے کے بعد خلاق معانی بحرِ فکر میں غوطہ زن ہوئے اور وہ درِ شہوار نکال لائے۔ جناب (اقبال) کا ارادہ

انھیں ایک نظم میں منسلک کرنے کا تھا مگر طبیعت کا رجحان کسی اور طرف ہو گیا اور یہ دو اشعار میرے پاس پڑے رہے جو امانت آج میں آج کل [ماہنامہ دہلی سے شائع ہوتا تھا] کے حوالے کرتا ہوں۔[۳۵]

تماشائے ڈل کن کے ہنگامِ شام
دہد شعلہ را آشیاں زیرِ آب
بشوید ز تن تا غبارِ سفر
زند غوطہ در آبِ ڈل آفتاب

(شام کے وقت ڈل کا تماشا تو کیجیے (کیوں کہ اس وقت) ڈل شعلہ کو پانی کی تہہ میں آشیاں دیتا ہے۔ بدن سے سفر کی گرد دھو ڈالنے کی غرض سے سورج جھیل ڈل میں غوطہ زن ہوتا ہے۔)

ڈل کی سیر کے دوران ہی ان کے پاس بعض کشمیری بچے ایک شکارے میں ''ترانہ ہندی'' گاتے جا رہے تھے۔ اس غیر متوقع چیز کو دیکھ کر اقبال بے حد خوش ہوئے۔''[۳۶]

جھیل ڈل[۳۷] نشاط باغ کے قدموں میں ہے۔ دونوں کے درمیان بس ایک سڑک حائل ہے۔ نشاط اور شالیمار باغ جھیل کے مشرق میں بالکل اس کے سر پر ہیں۔ لگتا ہے اس کی تاج پوشی پر مقرر ہیں جب کہ نسیم باغ مغرب میں (قدموں میں) قدم بوسی پر مامور ہے۔ نشاط یا شالیمار کی بارہ دری سے غروب آفتاب کے وقت جھیل ڈل کا نظارہ ایسا ہے ''جیسے ایک دلہن حیا سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ آئینے پر ایک آخری نظر ڈال کر، شب وصل کے لیے جا رہی ہو۔''[۳۸]

اقبال بھی لطیف ہواؤں کے ملائم جھونکوں کے درمیان موسم بہار (جون) کے جوبن پر نشاط باغ کی بارہ دری سے حیرت انگیز رنگینیوں سے ہم کلام ہوئے اور اپنے جذبوں کو ''ساقی نامہ'' کی صورت نظم کر دیا۔ پھولوں، دریاؤں اور جھیلوں کی اس سرزمین کے بے پناہ حسن کو حضرت اقبال سمیت ان گنت شعراء اور ادیبوں نے لفظوں کا تقدس عطا کیا جب کہ مغلوں نے فن تعمیر کے بے مثال نقش اس خاک پر چھوڑے ہیں۔ شاعر نے درست ہی کہا ہے کہ:

اک سبق دیتی ہیں تعمیریں پرانی ہی سہی
نقش باقی ہے، ہمارا نفس فانی ہی سہی[۳۹]

اقبال محض شاعر نہ تھے۔ وہ بیسویں صدی کی عالمی اسلامی احیائی تحریک کے پر جوش داعی بھی تھے۔ خطہ کشمیر کے قدرتی مناظر سے وہ متاثر ضرور ہوئے لیکن ڈوگروں کی شخصی حکومت کے استبداد اور کشمیریوں کی خوئے غلامی نے بھی اقبال کو بہت بے چین رکھا۔ کشمیر میں قیام کے دوران اور اس کے بعد آپ نے کشمیر سے متعلق جو کچھ لکھا اس میں اپنے بنیادی مقصد سے انحراف نہ کیا۔ اقبال کی شاعری ملت کے لیے ایک نئے دور نشاط انگیز کی نوید تھی۔ عرفانِ خودی، یاد ایام سلف، جہانگیری و جہانبانی کے ساتھ ساتھ اقبال شخصی اور قومی آزادی کے علمبردار تھے۔ محکومی اور غلامی کی ہر ادا اور انداز سے اقبال کو نفرت تھی۔ استعماری، سامراجی اور

چنگیزی طرزِ حکومت کے خلاف تو آپ تھے ہی، اس نظام پر راضی رہنے والے یا اس کے خلاف بغاوت نہ کرنے والوں کو بھی اقبال کوستے ہیں۔ اقبال کا مردِ مومن: ع ''دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں'' کی مانند ہوتا ہے۔ ایسے مردانِ حُر اقبال کو کشمیر میں نظر نہ آئے۔ اقبال کی خواہش ہو گی کہ کشمیری نوجوانوں میں بیداری اور خودی کا جذبہ پروان چڑھے تاکہ وہ شخصی استبداد کے خلاف صف بستہ ہوں اور دریائے جہلم کی شوریدہ سرلہریں ان کے وجود سے لرز جائیں۔ حریت فکر اور جدت فکر کا یہ نمائندہ شاعر جب کشمیریوں کی حالت زار دیکھتا ہے جن میں جوشِ عمل کا فقدان ہے تو تڑپ اٹھتا ہے۔ ''ساقی نامہ'' میں اقبال نے اہل کشمیر کی مفلوک الحالی، استحصال، توہم پرستی، تنگ نظری اور جہالت کا مکمل نقشہ کھینچا ہے''۔[۴۰] پہلے دس اشعار میں کشمیر کے حسین قدرتی مناظر کی تصویرکشی کی گئی ہے:

تو گوئی کہ یزداں بہشت بریں را
نہاد است در دامن کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را
رہا سازد از محنتِ انتظارے[۴۱]

(یہ قدرتی مناظر دیکھ کر) یوں لگتا ہے جیسے خدا تعالیٰ نے بہشت بریں کو نیچے لاکر پہاڑ کے دامن میں رکھ دیا ہے (یہ مناظر بے حد دل کش اور روح افزا ہیں) تاکہ اس ذات اقدس کی رحمت انسانوں کو انتظار کی محنت/ اذیت سے نجات دلا دے۔ یعنی اصل بہشت تو قیامت کے بعد ہی ملے گی لیکن خدا کی رحمت نے انسان کے لیے اسے زمین پر رکھ دیا ہے تاکہ وہ (انسان) یہیں اس میں گھومے پھرے اور زندگی کا لطف اٹھائے)۔[۴۲]

اقبال سے تین سو سال پہلے مغل بادشاہ جہانگیر نے بھی اس جنت نشاں کو دیکھ کر بے ساختہ کہا تھا:

گر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

(اگر زمین پر کوئی بہشت ہے تو وہ یہی ہے، وہ یہی ہے، وہ یہی ہے)

''ساقی نامہ'' کے آخری دس اشعار میں علامہ نے کشمیریوں کی غلامی اور ان کی معاشی صورت حال پر دُکھ اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اقبال ساقی (اللہ تعالیٰ) کے حضور ملتجی ہیں کہ کشمیریوں کی حالت زار بدل دے اور ان میں احساسِ زیاں، خودی اور آزادی کی تڑپ پیدا کر دے۔

بریشم قبا خواجہ از محنتِ او
نصیب تنش جامۂ تار تارے
نہ در دیدۂ او فروغ نگاہے
نہ در سینہ او دل بے قرارے

ارزاں مے فشاں قطرۂ بر کشیری
کہ خاکسترش آفریند شرارے [۴۳]

(اس کی محنت کی بدولت اس کے آقاؤں کا لباس تو ریشم کا یعنی بہت قیمتی ہے جب کہ اس کے اپنے جسم کے مقدر میں پھٹا پرانا لباس ہے۔ اسے محنت مزدوری کا معمولی صلہ ملتا ہے جب کہ کارخانوں وغیرہ کے مالک خوب دولت کما رہے ہیں۔ اس (کشمیری) کی آنکھوں میں نہ تو نگاہ کی چمک/روشنی ہے اور نہ اس کے سینے میں بے قرار دل ہی ہے۔ یعنی مسلسل غلامی کے باعث اس کا دل سوز و جذبہ سے خالی ہو چکا ہے اور وہ پوری طرح بے حس ہو کر اس طرح کی ذلت بھری زندگی کو قبول کیے ہوئے ہے۔ اے ساقی تو اس شراب کا قطرہ کشمیری کے دل پر گرا جس سے اس کی گیلی مٹی (بے حس جان) سے شرارے پیدا ہوں۔ ان میں ایسا سوز و جذبہ اور ولولہ پیدا ہو کہ وہ اپنی آزادی اور سربلندی کے لیے جدوجہد کر کے موجودہ ذلت کی زندگی سے نجات پا جائیں)۔ [۴۴]

ارمغانِ حجاز میں اقبال نے کشمیری مزدوروں کی حالت کا نقشہ اس انداز سے کھینچا ہے:

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالہ [۴۵]

اقبال، خضر کو استعارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمالہ کے دامن میں آباد قومیں کب خواب سے بیدار ہوں گی:

ہمالہ کے چشمے ابلتے ہیں کب تک
خضر سوچتا ہے وُلر کے کنارے [۴۶]

جھیل ڈل کی مشرقی سمت پر چشمہ شاہی [۴۷]، شالیمار باغ، نشاط باغ اور ہارون ہے۔ ان باغات اور سیر گاہوں کی پشت پر زبربن کا پہاڑ ہے۔ اقبال نے پیامِ مشرق میں ''کشمیر'' کے عنوان سے ایک اور نظم لکھی اُس میں بھی اِس جنت نشاں کے حسن کا دل کش تذکرہ ہے۔ نظم کے دوسرے شعر کے حوالے سے ایک الجھن باقی ہے:

باد بہار موج موج، مرغ بہار فوج فوج
صلصل و سار زوج، زوج برسرِ ناروَن نگر [۴۸]

(موسم بہار کی ہوا گویا موجوں کی صورت میں یعنی بہت چل رہی ہے۔ (جو دل کی کشادگی کا باعث بن رہی ہے) بہار کے پرندے فوج در فوج/بکثرت اڑ رہے ہیں۔ فاختاؤں اور سارسوں کو جوڑوں کی صورت میں یعنی بکثرت ناروَن کے درخت پر بیٹھے اور چہچہاتے دیکھ)

کلام اقبال کی جملہ شرحوں میں ''ناروَن'' کو ایک گھنے درخت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ لفظ مزید تحقیق کا طالب ہے۔ نشاط، شالیمار اور ہاروَن میں ناروَن کا کوئی درخت نہیں ہے۔ چناروں کے دیو ہیکل درخت ہیں، جن کا اقبال نے ذکر کیا ہے۔ ممتاز اقبال شناس ڈاکٹر بشیر احمد نحوی (ڈائریکٹر اقبال انسٹیٹیوٹ کشمیر یونی

ورسٹی سری نگر) نے بھی اس بات سے اتفاق کیا کہ یہ لفظ نارون نہیں بلکہ ہارون ہے۔ کتابت کی غلطی سے یہ اب غلط العام ہے۔ نارون بروزن ہارون غلطی کا امکان تو ہے۔

''ساقی نامہ'' کے علاوہ اقبال نے جاوید نامہ میں حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی اور غنی کشمیری سے اپنی ملاقات کو منظوم کیا ہے۔ ان ملاقاتوں میں بھی کشمیر اور اہل کشمیر کی غلامی اور جد و جہد آزادی زیر بحث ہیں۔ ''آنسوئے افلاک'' میں بھی وطن کے احوال ہیں۔ اقبال رجائیت پسند تھے۔ مایوسی اور پریشانی کے باعث اگر طبیعت کبھی مکدر ہوئی بھی تو عارضی، وہ تو ملّت کی نئی شیرازہ بندی کی تعلیم دیتے ہیں:

اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں[۴۹]

اقبال ایک جداگانہ اور منفرد پیغام کے داعی تھے۔ وہ کارگاہِ حیات میں ''محشر اٹھانے'' کی بات کرتے ہیں۔

ع: زمانہ دیکھے گا جب میرے دل سے محشر اٹھے گا گفتگو کا[۵۰]

مایوسی، قنوطیت اور محکومی کی زندگی گزارنے والوں کو اقبال خوش خبری دیتے ہیں کہ:

گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چُھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ ہر کوئی بادہ خوار ہو گا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا[۵۱]

اقبال پختہ یقین رکھتے تھے کہ استعماری اور سامراجی تسلط عارضی ہے اور ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کا خواب شرمندہ تعبیر ہو گا۔ اس مقصد کے لیے وہ ملت کی نئے اطوار پر تعمیر اور شیرازہ بندی کے قائل تھے۔ مسلمان نوجوانوں میں تن آسانی کے بجائے سخت کوشی کی صفت دیکھنا چاہتے تھے۔ محکومی اور غلامی کے مقابلے میں بہادری کے ساتھ آزادی اور حریت کا پرچم سربلند رکھنا ان کی آرزو تھی۔ شیشہ گرانِ فرنگ سے انھیں نفرت تھی۔ ہندو بنیے کی شاطرانہ چالوں سے وہ واقف تھے۔ بلاد اسلامیہ، جو استعماری شکنجے میں تھے ان کی آزادی اقبال کا خواب تھا۔ اس تسلسل میں وہ کشمیریوں کی محکومی پر دل گرفتہ تھے لیکن انھیں کشمیریوں کی حالت اور طرزِ عمل بھی ناپسند تھا۔ کشمیری غلامی کو مکافات عمل سمجھ کر قبول کر چکے تھے۔ ان کی زندگی جد و جہد اور تگ و دو سے خالی تھی۔ اقبال کو یہ روش پسند نہ تھی۔ اس لیے اقبال آرزو کرتے ہیں کہ کشمیریوں میں کوئی ایسا دیدہ ور پیدا ہو جائے جو انھیں: ''حاضر و موجود سے بیزار کرے''[۵۲]

دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے[۵۳]

صدیوں کی پیچ در پیچ غلامی کے باعث یہ کوئی سہل کام نہ تھا۔ ''ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کی بیاض'' کو استعارہ بنا کر اپنے وطن کے ابلتے ہوئے چشموں کی سیمابی کو موضوع بناتے ہیں اور کسی مرد درویش کی تلاش میں ہیں، جو اس مظلوم قوم کی کشتی کو شرمندہ ساحل کر دے۔

بیدار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیٔ لولاب[۵۴]

اقبال نے بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں کشمیری مسلمانوں کے لیے آزادی کی جدوجہد کرنے کی آرزو کی ہے۔ حیات اقبال ہی میں کشمیر میں بیداری اور جدوجہد کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ۱۳ر جولائی ۱۹۳۱ء کشمیری مسلمانوں کا ایک جم غفیر سامراجی جبر کے سامنے ڈٹ گیا اور ۲۲ مسلمانوں نے شہادت کا جام پیا۔ بیسویں صدی کے اختتام پر کشمیریوں کی جدو جہد آزادی نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ غلامی اور غلامی کے ہر نشان کو مٹانے کے لیے کشمیر میں ایک زبردست عوامی تحریک برپا ہوئی۔ جس نے ریاست کی تہذیب، کلچر اور انداز فکر کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ علامہ نے فرمایا تھا کہ ''برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خارزار ہوگا''،[۵۵] گویا آج کا کشمیر ۱۹۲۱ء سے یکسر مختلف ہے۔ آتش اور آہن کی بارش آج بھی جاری ہے لیکن لمحہ موجود میں شیخ محمد اقبال کے کشمیر کی نسل غلامی اور محکومی کو مکافات عمل اور تقدیر کا لکھا نہیں سمجھتی بلکہ آج کی نسل اقبال کے اس شعر کی تفسیر ہے:

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تھرتھراتا ہے جہانِ چار سو و رنگ و بو[۵۶]

البتہ تنظیم، باہمی اعتماد اور کسی متفقہ قیادت کے فقدان کے باعث یہ جدوجہد فیصلہ کن مرحلے میں داخل نہیں ہو سکی ہے لیکن یقین ہے کہ شاعر مشرق کی یہ حکیمانہ پیشین گوئی بھی پوری ہو گی کہ

چھپے رہیں گے زمانے کی آنکھ سے کب تک
گُہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یک دانہ[۵۷]

''آتش چنار'' کی تپش کشمیریوں کا لہو گرماتی رہے گی اور آب ولر کے موتیوں کی مانند بکھرے ہوئے تر دماغ اور چرب دست کشمیری ایک مالا کا روپ دھار لیں گے۔ غلامی اور محکومی کا جوا ان کی گردنوں سے اتر جائے گا۔ تب بادشاہی مسجد کے پہلو میں آسودۂ خاک ایک کشمیری سپرو کی روح کس قدر اطمینان محسوس کرے گی؟

۴

سری نگر دو ہفتے کے قیام کے بعد اقبال جولائی کے پہلے عشرے میں براستہ مظفر آباد واپس لاہور

آئے۔ اقبال کی واپسی کی تفصیلات ......سواری، طعام و قیام کے حوالے سے معلومات موجود نہیں، بس ۱۱؍جولائی ۱۹۲۱ء کے خط بنام منشی سراج الدین، اقبال خود بتاتے ہیں کہ ''آپ سے رخصت ہو کر پانچ بجے شام راولپنڈی پہنچ گئے اور چھے بجے شام کی ٹرین بھی مل گئی۔''[۵۸] اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال سری نگر سے صبح ہی چلے ہوں گے۔ پانچ بجے راولپنڈی پہنچے۔ واپسی پر ۱۲؍جولائی کو اقبال نے مولانا گرامی کو لکھا کہ ''کشمیر سے بیمار واپس آیا۔ ٹانگ میں درد ہے جس کی وجہ سے چلنے پھرنے میں دقت ہے۔''[۵۹]

اقبال ایک ہی بار کشمیر گئے۔ اگرچہ وطن مالوف جانے کی خواہش اور تڑپ دم آخریں تک برقرار رہی۔ ۱۹۳۳ء میں اقبال آل انڈیا مسلم کشمیر کمیٹی کے صدر منتخب ہوئے تو انھوں نے کشمیر جانے کا قصد باندھا لیکن مہاراجہ کی شخصی حکومت نے اقبال کے ریاست میں داخلے پر پابندی لگا دی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے مطابق:

جولائی ۱۹۳۷ء کے اوائل میں اقبال نے گرمیوں کے چند ماہ کشمیر میں گزارنے کا ارادہ کیا۔ خیال تھا کہ موسم گرما کی تعطیلات کے لیے راقم کا اسکول بند ہونے پر (راقم ان ایام میں سنٹرل ماڈل اسکول میں پڑھتا تھا) ۱۲؍جولائی ۱۹۳۷ء کے بعد سری نگر روانہ ہوا جائے۔ اقبال کے ایک عقیدت مند سید مراتب علی نے سفر کے لیے اپنی اسٹیشن ویگن جس میں سات آٹھ آدمی بیٹھ سکتے تھے دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن کشمیر میں اقبال کا داخلہ تحریک کشمیر کے ایام سے ممنوع تھا۔ چناں چہ ریاستی حکام سے اس سلسلہ میں اجازت حاصل کرنے کے لیے خط و کتابت کی گئی۔ پہلے تو خاصی مدت تک اقبال کو کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ مگر بالآخر جب ریاستی حکام نے سفر کشمیر کی اجازت دی تو موسم گرما گزر چکا تھا۔ یوں وہ زندگی میں آخری بار اپنے آبائی وطن کی زیارت کرنے سے بھی محروم رہے۔[۶۰]

اقبال کے کشمیر میں داخلے پر پابندی ۱۹۳۷ء تک برقرار رہی۔ ۱۹۳۴ء کے بعد اقبال کی صحت کے بدستور خراب رہنے کے باعث کشمیر جانے کی دوبارہ خواہش تشنۂ تکمیل رہی لیکن جس طرح رموز بے خودی (۱۹۱۸ء ص ۱۷۰) میں بیان کردہ ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی کہ: ''آرزو دارم کہ میرم در حجاز'' (میری آرزو ہے کہ مجھے موت آئے تو سرزمین حجاز میں) اسی طرح ''تنم گلے ز خیابانِ جنت کشمیر'' (میرا بدن خیابانِ کشمیر کا پھول ہے) کہنے والا اقبال جس باغ کا پھول تھا اس سے دوبارہ ہم دوش نہ ہو سکا۔ اور ۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء کو عالمِ جاودانی کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ اس آفاقی شاعر کی موت، موت العالم کے مصداق تھی۔ پنجاب اور لاہور کی سرزمین میں تو کہرام بپا ہونا ہی تھا۔ پورے عالم اسلام میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کشمیر میں جب یہ اندوہناک خبر پہنچی تو ماحول پر تاریکی اور سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ کیوں نہ ہوتا کہ صدیوں کے بعد کشمیر کے لالہ زاروں سے ایک رومی (اقبال رومی کو مرشد معنوی تصور کرتے تھے) اٹھا تھا جس نے آب و گِل کشمیر سے غلامی کے ہر نشان کو مٹانے کے لیے خونِ جگر کی روشنائی سے فکر تازہ پیش کی تھی۔

اقبال کے انتقال پُر ملال کی دل گداز خبر جونہی سری نگر پہنچی تو یہاں صفِ ماتم بچھ گئی۔ پروفیسر غلام نبی

فراق نے اپنے ایک کشمیری مقالہ میں لکھا ہے کہ وہ ان ایام میں اسلامیہ ہائی سکول گوجوارہ سری نگر میں زیرِ تعلیم تھے۔ اقبال کے فوت ہونے کی خبر پہنچتے ہی سکول بند ہو گیا۔ ساری دکانیں فوری بند کر دی گئیں اور رات گئے تک ہر کشمیری گھر میں اس محسنِ کشمیر کے چرچے رہے۔[۶۲]

حواشی و حوالہ جات

۱- ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، بزم اقبال لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۵۵۔
۲- کلیاتِ اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۳۴۸۔
۳- عبدالحمید یزدانی، شرح پیام مشرق، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۴ء، ص، ۲۳۷-۲۳۶۔
۴- فکر اقبال، ص ۵۵۔
۵- جگن ناتھ آزاد، اقبال اور کشمیر، مکتبہ علم و دانش مزنگ لاہور، ص ۹۔
۶- ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، علامہ اقبال: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۱۵۔
۷- کلیاتِ اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان، طبع ہشتم، ۲۰۰۷ء، ص ۵۳۰۔
۸- بشیر احمد ڈار، (مرتب)، انوار اقبال، اقبال اکادمی پاکستان کراچی، بار اول، ۱۹۸۷ء، ص ۶۷۔
۹- ''اقبال کے آباو اجداد..... بعض مباحث''، ماہنامہ شیرازہ، جموں اینڈ کشمیر کلچرل اکیڈمی، جلد ۳۴، شمارہ ۴۔۵، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۴۔۱۷۵۔
۱۰- عروج اقبال، بزم اقبال، کلب روڈ، لاہور، بار اول، ۱۹۸۷ء، ص ۳۔
۱۱- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود (حیات اقبال کا اختتامی دور)، شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۸۷ء، ص ۳۔
۱۲- زندہ رود، ص ۶۔
۱۳- ایضاً، ص ۱۱۔
۱۴- ایضاً، ص ۱۱
۱۵- علامہ اقبال: کی شخصیت اور فن، ص ۱۵۔
۱۶- عروج اقبال، ص ۳۔
۱۷- محمد عبداللہ قریشی، روح مکاتیبِ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۷۷ء، ص ۱۲۲۔
۱۸- ایضاً، ص ۱۲۵۔
۱۹- کلیاتِ اقبال، ص ۳۵۰۔
۲۰- محمد عبداللہ قریشی، روح مکاتیبِ اقبال، ص ۱۷۶۔

۲۱- ایضاً،ص ۱۷۵۔
۲۲- کلیاتِ اقبال (اردو)، اقبال اکادمی پاکستان طبع ہشتم ۲۰۰۷ء، ص ۳۵۰۔
۲۳- ایضاً،ص ۳۱۰۔
۲۴- ڈاکٹر صابر آفاقی، مظفر آباد، مقبول اکیڈمی لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۸۸۔
۲۵- ایضاً،ص ۸۹۔
۲۶- کلیاتِ اقبال (اردو)،ص ۴۵۰۔
۲۷- ایضاً،ص ۴۷۷۔
۲۸- شیرازہ، جلد نمبر ۶، شمارہ نمبر ۱۱، ص ۳۲۱ تا ۳۴۹۔
۲۹- کلیات اقبال (اردو)،ص ۴۵۲۔
۳۰- ایضاً،ص ۴۵۰۔
۳۱- روح مکاتیب اقبال، ص ۲۸۹۔
۳۲- **نشاط باغ**: شالیمار سے 3.2 کلومیٹر دور ہے۔ یہ بھی ڈل کے کنارے ہے اور اس کی پشت پر بھی زبربن پہاڑ ہے۔ اس باغ کو 1633ء میں بیگم نور جہاں کے بھائی آصف خان نے تعمیر کرایا تھا۔ باغ کے دس Terraces ہیں جو ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ درمیان میں ایک نہر ہے جو ہر Terrace میں ایک چھوٹی سی آبشار کی صورت گرتی ہے۔
۳۳- **شالیمار باغ**: زبربن پہاڑ کے دامن میں چار روشوں (Terraces) میں منقسم ہے۔ درمیان سے نہر بہتی ہے۔ جس کا پانی مین گیٹ کے ساتھ ایک چھوٹی سے آبشار کی مانند سڑک کے ساتھ چھوٹے سے تالاب میں گرتا ہے جس کی آخری منزل جھیل ڈل ہے۔ باغ کی لمبائی چوڑائی 182m x 539m ہے۔ شالیمار باغ مغل بادشاہ جہانگیر نے اپنی بیگم نور جہاں کی فرمائش پر بنوایا تھا۔ جہانگیر نے خود ۱۱ مرتبہ کشمیر کا سفر کیا بلکہ وہ سفر کشمیر کے دوران راستے میں فوت ہوا۔
۳۴- **محمد عمر**: محمد عمر 'جموں' کے اہل قلم تھے۔ آپ نے اپنے وقت میں دل پسند ڈرامے لکھے اور ڈراموں کے متعلق مقالے بھی۔ جموں میں آپ اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ نور الٰہی اس زمانے میں جموں کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ دونوں دوست تھے بلکہ یک جان دو قالب کی مثال تھے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ محمد عمر اپنی ادبی تحریروں میں ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ نور الٰہی کا نام بھی بالالتزام لکھا کرتے تھے۔ چناں چہ ادبی دنیا میں محمد عمر ''محمد عمر نور الٰہی'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (جگن ناتھ آزاد، اقبال اور کشمیر، ص ۱۰۸)۔
۳۵- ڈاکٹر بدرالدین بٹ، جامعہ کشمیر اور اقبالیات، اقبال انسٹیٹیوٹ آف کلچر اینڈ فلاسفی سری نگر، ۲۰۰۹ء، ص ۵۹۔۶۰۔
۳۶- ماہنامہ آج کل، اکتوبر ۱۹۴۵ء، منقول از جگن ناتھ آزاد ص ۱۰۸۔۱۰۹۔
۳۷- **جھیل ڈل**: 8 کلومیٹر لمبی اور 4 کلومیٹر چوڑی جھیل ہے۔ اس کے مشرق میں چشمہ شاہی، شالیمار باغ، نشاط باغ اور ہارون ہیں۔ جب کہ مغرب کی طرف نسیم باغ، یونیورسٹی آف کشمیر، حضرت بل واقع ہیں۔ جھیل کے اندر ایک جزیزہ نما ہے جس میں چار چنار ایستادہ ہیں اسے ''چار چناری'' کہتے ہیں۔ یہ صدیوں پرانے درخت ہیں۔ جن کے درمیان ایک چھوٹا سا پارک ہے۔ اس کے علاوہ جھیل کے اندر نہرو پارک بھی ہے۔ جھیل کی سطح پر کنول کھلتے ہیں۔ کناروں پر مستقل ''ہاؤس بوٹ'' ہیں۔ جھیل کے درمیان میں بھی ہاؤس بوٹ ہیں۔ کناروں پر سبزی کے کھیت ہیں۔ جھیل کے اوپر ہی ہاؤس بوٹ مارکیٹیں ہیں، جہاں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں دستیاب ہیں۔ جھیل سے خشکی تک رابطے کا ذریعہ شکارا (چھوٹی کشتی) ہے۔ ہاؤس بوٹ صدیوں پہلے کسی انگریز کی ذہن رسا کی خوب صورت اختراع ہے۔

۳۸- یوسف ٹینگ، (مرتب)، طامس مور، چنار رنگ، جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی سری نگر، ۱۹۷۷ء، ص ۲۰۔
۳۹- ایضاً، ص ۱۵۵۔
۴۰- غلام نبی خیال، اقبال اور کشمیر، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۹۹ء، ص ۹۶۔
۴۱- کلیاتِ اقبال فارسی، ص ۲۸۵۔
۴۲- عبدالحمید یزدانی، شرح پیامِ مشرق، ص ۱۳۵۔
۴۳- کلیاتِ اقبال (فارسی)، ص ۲۸۶۔
۴۴- شرح پیامِ مشرق، ص ۱۳۷۔
۴۵- کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۰۷۔
۴۶- کلیات اقبال، ص ۶۴۷۔
۴۷- **چشمہ شاہی**: سری نگر شہر سے 8.8 کلو میٹر فاصلے پر ہے۔ جھیل ڈل کے مشرقی کنارے پر اور گورنر ہاؤس کے قریب ہے۔ عقب میں زبربن کی پہاڑی ہے۔ چنار کے دیوہیکل درختوں نے اس باغ کو گھیرا ہوا ہے۔ مغل بادشاہ شاہ جہان نے اسے بنایا تھا۔ اس کا پانی طبی نقطۂ نظر سے مشہور ہے۔ سینہ گزٹ ہے کہ جواہر لعل نہرو اس کا پانی پینے کے لیے منگواتے تھے اور مہاراجا ہری سنگھ بھی خصوصی مواقع پر یہی پانی نوش کرتے تھے۔
۴۸- کلیات اقبال فارسی، ص ۳۰۲۔
۴۹- کلیات اقبال (اردو)، ص ۳۲۷۔
۵۰- ایضاً، ص ۱۶۲۔
۵۱- ایضاً، ص ۱۶۷، ۱۶۶۔
۵۲- ایضاً، ص ۵۶۲۔
۵۳- ایضاً، ص ۵۶۳۔
۵۴- ایضاً، ص ۳۸۷۔
۵۵- ایضاً، ص ۱۶۶۔
۵۶- ایضاً، ص ۲۹۷۔
۵۷- ایضاً، ص ۴۵۷۔
۵۸- روح مکاتیبِ اقبال، ص ۲۶۳۔
۵۹- ایضاً، ص ۲۶۴۔
۶۰- ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود (حیات اقبال کا اختتامی دور)، ص ۶۱۱۔
۶۱- کلیاتِ اقبال (اردو)، ص ۶۷۴۔
۶۲- شیرازہ (کشمیر خصوصی اشاعت) جلد ۱۳، شمارہ ۴، ۱۹۷۷ء، ص ۶۹۷۔